فلسفۂ خودی کا جذبۂ محرکہ

اقبال کا اصل مسلک عشق محمدی ہے۔ وہ ہر چیز کو بھی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے خدا کو بھی ' رب محمد ' ہونے کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ یعنی جس نے محمد جیسے کامل انسان کو بنایا ہے وہ خود کیا ہوگا۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک فلسفی نے ان سے پوچھا کہ خدا کے وجود کے عقلی دلائل کیا ہیں؟ اقبال نے جواب دیا عقلی دلائل کا تو یہ حال ہے کہ جتنے دلائل خدا کے ہونے کے دیئے جاسکتے ہیں اتنے ہی دلائل اس کے نہ ہونے کے بھی پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ اس نے ذرا متعجب ہو کر پوچھا: پھر آپ کیوں خدا کے وجود کے قائل ہیں؟ اقبال نے اس کا جو جواب دیا وہ ایک عجیب حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ انہوں نے کہا میں تو صرف اس لئے خدا کے وجود کا قائل ہوں کہ محمد جیسا انسان کہتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ وہ جسے کہ دے کہ ہے وہ ہے اور وہ جسے کہ دے کہ نہیں ہے وہ نہیں ہے۔

اس جواب سے بہ آسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال نے محمد رسول اللہ کو جتنا کچھ اپنی عقل سے سمجھا اس سے کہیں زیادہ عشق کی نگاہوں سے دیکھا۔ محمد کا نام نامی سنتے ہی اس کی آنکھیں اشکبار ہوجاتی تھیں۔ وہ خدا سے ناز بھرے انداز سے لڑنے جھگڑنے میں تامل نہیں کرتا لیکن محمد کے سامنے اس کا سر ادب ہمیشہ جھکا رہتا تھا۔ رومی نے کہا ہے:

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند　　فرشتہ صید، پیمبر شکار، یزدان گیر

یعنی خدا کی کبریائی کے زیر سایہ کچھ بلند ہمت مردان خدا ایسے بھی ہیں جو فرشتے اور پیغمبر بلکہ خدا پر بھی اپنی کمند ڈال لیتے ہیں۔ اقبال کو یہ شعر بہت پسند تھا۔ وہ بھی اس مضمون کو اپنے انداز میں ادا کرنے کے لئے بے چین ہوئے مگر پیغمبر کے ذکر کی جرأت نہ کر سکے۔ ادب مانع تھا اس لئے اتنا کہہ کر رہ گئے:

در دشت جنون من جبریل زبون صیدے　　یزدان بکمند آور اے ہمت مردانہ

اقبال جانتا ہے کہ خدا عالم الغیب و الشہادہ ہے۔ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھی جاسکتی اس لئے اپنا اعمال نامہ خدا کے حضور پیش ہونے سے نہیں گھبراتا۔ اقبال کو اگر کوئی گھبراہٹ ہوتی ہے' کوئی شرم دامنگیر ہوتی ہے، کوئی خطرہ ستاتا ہے، تو صرف یہ کہ کہیں محمد کے سامنے میری رسوائی نہ ہو اور میرے نامۂ سیاہ کو دیکھ کر محمد کو صدمہ نہ ہو۔ اس لئے وہ بارگاہ ایزدی میں انتہائی درد مندی، بےچینی اور دکھے ہوئے دل سے دعا کرتا ہے:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر　　روز محشر عذر ہائے من پذیر

یا اگر بینی حسابم ناگزیر　　از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اس مضمون کو اقبال دوسری جگہ یوں دہراتا ہے:

مکن رسوا حضور خواجہ ما را — حساب ما ز چشم او نہاں گیر

غرض اقبال کا اوڑھنا بچھونا عشق محمدی ہے - مرکزی تصور عشق محمدی ہے - سارے کلام کا محور عشق محمدی ہے اور اسی محور کے گرد اقبال کی تمام شاعری گردش کرتی ہے - وہ خود کہتا ہے:

هر که عشق مصطفیٰ سامان اوست — بحر و بر در گوشۂ دامان اوست

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است — آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است

وہ بے تکان کہتا ہے:

طور موجے از غبار خانہ اش — کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

این زمین از بارگاهت ارجمند — آسمان از بوسۂ "بایت" بلند

اس سے بھی زیادہ:

معنی حرفم کنی تصدیق اگر — بنگری با دیدۂ صدیق اگر

قوت قلب و جگر گردد نبی — از خدا محبوب تر گردد نبی

اس قسم کے جذبات سن کر بعض خدا پرست موحدوں کی پیشانی پر بل پڑجائیں تو یہ قدرتی بات ہے اور وہ اس ناگواری میں مخلص بھی ہیں - جب وہ سنتے ہیں:

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اور جب وہ پڑھتے ہیں:

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے

بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جائی ہے

تو خدا پرستوں کا چیں بجبیں ہونا ایک فطری تقاضا ہے لیکن ہم اس مقام پر اقبال کی طرف سے صرف اسی قدر صفائی پیش کرنے پر اکتفا کریں گے:

با خدا دیوانہ و با مصطفیٰ ہشیار باش

اقبال کے تصورات کا سارا محور ہی عشق محمدی ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے اسی جذبے سے کہتا ہے:

اے شیخ پاک دامن معذور دار "او" را

صلح نامہ حدیبیہ کے آغاز میں "بسم اللہ الرحمان الرحیم" لکھا گیا تھا- کفار قریش نے اعتراض کیا کہ ہم رحمان و رحیم کو نہیں جانتے- ہمارے ہاں "باسمک اللھم" لکھا جاتا ہے- حضور نے کاتب صلح نامہ سیدنا علی مرتضی کو حکم دیا کہ بسم اللہ الرحمان الرحیم کو کاٹ کر باسمک اللھم لکھو- حضرت علی نے فوراً تعمیل ارشاد کرلی - اس کے بعد قریش نے دوسرا اعتراض کیا کہ اس میں لکھا ہے "ھذا ما عاھد علیہ محمد رسول اللہ" (یعنی یہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ نے کیا ہے) - اگر ہم رسول اللہ ہی مان لیتے تو جھگڑا کاہے کا تھا؟ لہذا اسے کاٹ کر "محمد بن عبداللہ" لکھئے- حضور نے پھر حضرت علی سے فرمایا کہ رسول اللہ کاٹ کر "بن عبداللہ"

لگھ دو - حضرت علی نے دوات قلم رکھ دیا اور صاف کہ دیا کہ مجھ سے یہ نہیں ہوگا - ذرا سوچئے - معترض تو یہاں بھی اعتراض کرسکتا ہے کہ رحمان و رحیم تو کاٹ دیا لیکن رسول اللہ کا لفظ قلمزد کرنے سے انکار کردیا - لیکن کسی کو کیا معلوم کہ علی کی اس نافرمانی پر کتنی فرمانبرداریاں قربان ہیں - اور یہ ادب و احترام عشق محمدی کا کتنا عظیم الشان نمونہ ہے - بس کچھ ایسا ہی جذبہ اقبال میں بھی کبھی پیدا ہو جاتا ہے - با خدا دیوانہ و با مصطفی ہشیار باش - وہ ہر شے کو عشق محمدی ہی کے پیمانے سے ناپتے ہیں - وہ جب امت کی زبون حالی دیکھتے ہیں تو انہیں صرف اس لئے صدمہ ہوتا ہے کہ محمد کی امت کا یہ حال کیوں ہے؟ بس خدا سے جھگڑنے کھڑے ہوجاتے ہیں - '' شکوہ '' کا ہر شعر اس کا گواہ ہے - پھر جب وہ دین اسلام کی بے بسی دیکھتے ہیں تو انہیں فقط اس لئے اذیت ہوتی ہے کہ محمد کے لائے ہوئے دین کی یہ حالت کیوں ہے ؟ اس وقت وہ مسلمانوں پر برس پڑتے ہیں جس کی شہادت '' جواب شکوہ '' کے ایک ایک شعر سے ملتی ہے - غرض وہ خدا سے خفگی کا اظہار کرتے ہیں تو محمد کی امت کی خاطر اور مسلمانوں پر برستے ہیں تو محمد کے دین کی خاطر - دونوں کا مرکز ایک ہی ذات ہے اور دونوں قسم کی خفگیاں عشق محمدی ہی کے جذبے کے زیر اثر ہیں :

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

جب مسلمانوں سے ناراض ہوئے تو نہ ملّا کو چھوڑا نہ صوفی کو ، نہ مولوی کو بخشا نہ مفتی کو ، نہ امام کو معاف کیا نہ خطیب کو - نہ دوسرون کو قابل درگزر سمجھا نہ اپنے آپ کو - انہوں نے محسوس کیا کہ دین اسلام تو ایک زندہ و پائندہ حقیقت ہے ، یہ نہیں مرسکتا - مردہ تو وہ مذہب ہے جو ہمارے مختلف کوتاہ نظر مذہبی اجارہ داروں نے خود وضع کرلیا ہے اور اسی کو اسلام کا نام دے دیا ہے - خواہ غلط فہمی کی وجہ سے ہو یا اپنے مفاد کی خاطر -

دین کو مسخ کرنے والے عوامل میں اقبال کو دو چیزیں بہت نمایاں نظر آئیں - ایک عام فقیہوں کا جمود جس نے دین کو ایک متحرک حقیقت کی بجائے جامد مذہب بنا کر رکھ دیا - اور دوسرے عام صوفیوں کے وہ روحانی تصورات جو عجم سے مستعار لئے گئے - ان تصورات میں سب سے نمایاں وحدت الوجود کا عقیدہ تھا - اس عقیدے پر تفصیلی روشنی ڈالنے کا یہ موقع نہیں - اتنا بتادینا کافی ہے کہ اس عقیدے کے اثر سے نوے فی صد سے زیادہ صوفیا جبری ہوتے رہے - پھر جب جبریت اور عدم اختیار کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہوگیا کہ یہ ساری کائنات چونکہ خدا ہی کے جمال و جلال کا مظہر ہے اس لئے جو کچھ ہوتا ہے اسی کی طرف سے ہوتا ہے - گویا نہ انسان کا اپنا کوئی اختیار ہے ، نہ اخلاق اقدار کی کوئی قدر و قیمت ، نہ سزا و جزا کی کوئی توجیہ ممکن ہے ، نہ نیکی و بدی کا کوئی مطلب ، نہ امر و نہی کے کوئی معنی اور نہ سزا و جزا کا کوئی مفہوم - انسان بس ایک مشینی کٹھ پتلی ہے جس سے باز پرس یا

جوابدہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پھر جب مسئلہ تقدیر اسلام کا چھٹا رکن بنا تو انسانی بے اختیاری کی رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ تقدیر کا عام مفہوم یہ سمجھا جانے لگا کہ جو کچھ دنیا میں ہونے والا ہے وہ سب لوح محفوظ میں لکھا جاچکا ہے اور اس کے خلاف کچھ نہیں ہوسکتا، ایک پتہ بھی اذن الٰہی کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ گویا انسان بالکل مجبور ہے۔ اس کی تہجد گزاری بھی اس کی تقدیر ہے اور چوری بھی اس کی لکھی ہوئی قسمت ہے۔ وہ اپنی تقدیر سے مجبور ہے۔ از خود اپنے اختیار سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے اس تصور تقدیر کے بعد سعی و عمل جدوجہد اور کوشش و تدبیر بے معنی ہو جاتی ہے اور جب یہ عقیدہ کسی قوم کے دماغوں پر مسلط ہو جائے تو اس میں بے عملی اور ترک تدبیر پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ اور یہ تقریباً ویسا ہی عقیدہ ہو جاتا ہے جیسا کہ ہندوؤں میں چار ورنوں کے متعلق موجود ہے۔ یعنی برہمن یہی سمجھے کہ وہ حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور شودر یہ ایمان رکھے کہ وہ ان کی غلاظت اٹھانے کے لئے ہی وجود میں آئے ہیں اور یہی ہماری نہ بدلنے والی تقدیر ہے۔

میرے ایک عزیز ایک ایسے علاقے میں گئے جہاں دو ایک رئیس داد عیش دے رہے تھے اور باقی عوام بھوک سے مر رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ تمہارے سردار تو عیش کرتے ہیں اور تمہیں پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا "اللہ کی مرضی ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنے اوپر بے تدبیری و بے عملی کا کوئی الزام نہیں لینا چاہتا۔ وہ خوبصورتی کے ساتھ یہ الزام تقدیر کے کاندھوں پر ڈال کر الگ ہوجاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اگر اس میں کچھ کرنے کا جذبہ پیدا بھی ہو تو تقدیر کا عقیدہ اسے تھپکیاں دے دے کر سلادیتا ہے اور اس کے جذبۂ عمل کو دبا دیتا ہے۔ وحدت الوجود اور تقدیر کے ڈانڈے جب آپس میں ملے اور بے عملی و ترک تدبیر اذہان پر چھا گیا تو پوری قوم "تن بہ تقدیر" ہو کر رہ گئی۔ ذلت، نکبت، محکومی، بے چارگی، بد حالی، حتی کہ بے دینی اور بد عملی بھی صرف اس لئے گوارا ہونے لگی کہ یہ تقدیر الٰہی ہے اور انسان کا اس میں کوئی بس ہی نہیں چل سکتا کیونکہ وہ تو مجبور ٹھہرا۔ اختیار ہو تو سعی و عمل بھی ہو۔ اس تصور اور اس کے نتیجے میں ترک عمل نے اقبال کو بے چین کردیا۔ وہ ایک دو دھاری تلوار لے کر میدان میں کود پڑے۔ ایک طرف وہ تقدیر کے اس غلط تصور پر وار کرنے لگے اور دوسری جانب وحدت الوجود کے عقیدے پر ضرب لگانے لگے۔ اقبال کی اسی تلوار کا نام فلسفۂ خودی ہے۔ آپ تقدیر کے متعلق کہتے ہیں:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں — تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

تیسری جگہ گرج کر کہا :

کافر ہے تو تقدیر پہ کرتا ہے بھروسا مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

اور چوتھی جگہ پوری تیزی و تندی کے ساتھ بول پڑے :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ملاحظہ فرمایا آپ نے ؟ خودی کی تلوار کی یہ ایک دھار ہے جس کا وار عقیدۂ تقدیر پر پڑ رہا ہے - اس تلوار کی دوسری دھار نے عقیدۂ وحدت الوجود کی طرف رخ کیا اور اس کے سب سے بڑے مبلغ شیخ اکبر محی الدین بن عربی سے ٹکر لے لی - اس کی تھوڑی سی تفصیل سن لیجئے -

۱۶ فروری ۱۹۱۶ کو علامہ اقبال نے (حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کو) ایک خط میں لکھا کہ تجلی ذاتی کا ذکر کرتے ہوئے شیخ اکبر فرماتے ہیں :

و ما بعد هذا التجلی الا العدم المحض فلا تطمع و لا تحب فی ان ترقی من هذه الدرجة من التجلی الذاتی -

(ترجمہ - اس تجلی کے بعد عدم محض ہے لہذا اس بات کی نہ امید رکھو نہ خواہش کہ تجلی ذاتی کے اس مقام سے اوپر بھی جا سکوگے) -

شیخ اکبر محی الدین بن عربی کے اس تصور سے اختلاف کرتے ہوئے اقبال ۹ مارچ ۱۹۱۶ کے خط میں پھر لکھتے ہیں :

فارسی شعرا نے جو تعبیر اس مسئلے کی ہے اور جو نتائج اس سے پیدا ہوئے ہیں ان پر مجھے سخت اعتراض ہے - یہ تعبیر مجھے نہ صرف عقائد اسلامیہ کے خلاف معلوم ہوتی ہے بلکہ عام اخلاقی اعتبار سے بھی اقوام اسلامیہ کے لئے مضر ہے - یہی تصوف عوام کا ہے اور شیخ علی حزین نے بھی اسی کو مدنظر رکھ کر کہا تھا کہ '' تصوف برائے شعر گفتن خوب است''۔ (یہ خطوط ''خاتم سلیمانی'' میں اور ماہنامہ '' ثقافت '' میں شائع ہوچکے ہیں اور اصل حالت میں جناب طفیل صاحب مدیر نقوش کے پاس محفوظ ہیں) -

ایک اور موقع پر اقبال نے اس قسم کے تصوف کے متعلق کہا کہ :

'' یہ اسلام کی سر زمین میں ایک اجنبی پودا ہے ''۔

وحدت الوجود کے عقیدے سے جو نتائج پیدا ہوئے اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے جو مختلف شعرا نے کہے ہیں - مثلاً ایک شعر یہ ہے -

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ — خود رند سبو کش

خود بر سر آن کوزہ خریدار برآمد — بشکست و روان شد

اقبال کی طرف سے اس کا جواب بھی سنتے چلئے :

خود گیری و خود داری و گلبانگ انا الحق

آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات

محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ''همه اوست،،

خود مردہ و خود مرقد و خود مرگ مفاجات

میر تقی میر نے تو اور صفائی سے کہ دیا :

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

اور حافظ شیرازی پکار اٹھے :

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من ست

اس شعر کا داخلی تضاد ملاحظہ ہو کہ حافظ گناہ کو تو انسانی اختیار سے باہر بتاتے ہیں لیکن گناہ کو اپنی طرف منسوب کرنے کے لئے جو طریقہ ادب بتاتے ہیں اس کے لئے کوشش کی فرمائش بھی کرتے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ جب سارے اعمال ہی خدا کی طرف سے ہیں تو ادب اختیار کرنے کے لئے یہ کوشش کیسی؟

بھارت کے صوبہ بہار مین ایک ضلعی صدر مقام ہے چھپرا ۔ یہاں کے محلہ '' کریم چاہ '' میں ایک صدی پیشتر لوگ بڑے زور و شور سے محرم مناتے تھے لیکن ساتھ ہی وحدت الوجود کے بھی قائل تھے۔ یعنی وہی ایک ذات حسین بھی ہے اور وہی یزید بھی ۔ چنانچہ ایک شاعر نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر واقعہ کربلا کا نقشہ یوں کھینچا :

اللہ نے اللہ کو پانی نہ پلایا اللہ نے اللہ کے خیمے کو جلایا

اسے کہتے ہیں '' ڈائریکٹ اپروچ '' جو دل میں تھا صاف لفظوں میں کہ دیا ۔ نہ کوئی گھماؤ پھراؤ ہے نہ کوئی اپج پیچ ۔ ایسا مضمون ہے کہ شعر پڑھتے ہی وحدت الوجود کا سارا مسئلہ سمجھ میں آجاتا ہے ۔

پٹنہ (عظیم آباد) کی ایک مشہور خانقاہ میں خاص خاص مریدوں کو ایک ذکر اور اس کے مراقبے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور وہ ذکر ہے ''لا الہ الا انا'' یعنی میرے سوا کوئی خدا نہیں (میں تو خدا ہوں باقی ساری کائنات غیر خدا ہے) ۔ یہاں پھر وہی دوئی آگئی جسے مٹانے کے لئے یہ وحدت الوجود کا ذکر و مراقبہ ایجاد کیا گیا تھا ۔ ایسے ہی ذاکر و شاغل گوشہ نشیں صوفیوں کو مخاطب کرکے اقبال کہتا ہے :

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سجود تری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں
زبان نے کہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہر حال دیکھنا یہ چاہئے کہ اس عقیدے کا عملی زندگی پر اثر کیا پڑتا ہے ؟ ظاہر ہے کہ اس کا اثر تعطل عمل ہی ہوسکتا ہے ۔ نہ بدی سے جنگ کی ضرورت، نہ نیکی کی اشاعت کی حاجت ۔ اس لئے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے اور سب اس کے جلوے ہیں اور اسی کی طرف سے ہیں ۔ اس میں انسان کا کوئی اختیار ہی نہیں جسے وہ کام میں لاسکے ۔ اس تصور سے اسلام کے تمام اوامر و نواہی اور اس کی دی ہوئی ساری اخلاقی اقدار عبث و بے کار ہوجاتی ہیں ۔ باز پرس، جوابدہی اور سزا و جزا کے کوئی معنی نہیں

رہتے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کی وحدت الوجود میں انسان کا کوئی الگ انفرادی وجود ہی باقی نہیں رہتا۔

یہ چیز اقبال کو کھا گئی اور اس نے خودی کا فلسفہ قوم کے سامنے پیش کیا جس کا مطلب آسان لفظوں میں یہ ہے کہ خدا سے الگ ہمارا ایک انفرادی وجود ہے اور یہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ ہم خدا میں جذب ہوکر ختم نہیں ہوں گے بلکہ صفات خدا کو اپنے اندر جذب کرکے اپنی انفرادیت کو اور زیادہ مستحکم بنائیں گے۔ ہمارا انجام ''عدم محض'' نہیں جیسا کہ ابن عربی کہتے ہیں بلکہ بقائے دوام ہمارا انجام ہے۔ ہم مجبور کٹھ پتلی نہیں کہ تار ہلانے والا جس طرح چاہے تار ہلادے اور ہم اس کے اشارے پر ناچتے رہیں۔ ہم خود ایک الگ با اختیار وجود رکھتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اپنے ارادہ و اختیار سے کرتے ہیں اور اسی کے مطابق نیک و بد یا تخریبی و تعمیری نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔ ہم مجبور و بے اختیار نہیں۔ اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔ ہم خود اپنے ارادہ و اختیار سے اپنے آپ کو تباہ و برباد کرکے ذلت کے عمیق غار میں گراتے ہیں اور خود ہی اپنے عمل سے افلاک کی بلندیوں کو چیرتے ہوئے کائنات کی تسخیر کرتے ہیں۔ ہم مشیت کے آگے جمادات و نباتات کی طرح سر نہیں جھکائے رہتے بلکہ مشیت سے جنگ کرتے ہیں اور یہی جنگ کرکے رضائے الٰہی حاصل کرتے ہیں۔ ہم جبر کے آب و گل سے پیدا ہوئے ہیں لیکن ہماری ساخت میں بے پناہ اختیارات کا خمیر رکھ دیا گیا ہے:

فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد

ہم ہی خود ساز ہیں، ہم ہی خود شکن ہیں، ہم ہی خود گر ہیں اور ہم ہی خود نگر ہیں۔ ہم ہی خود دار اور ہم ہی خود شناس ہیں۔ یہ ساری کائنات نامکمل ہے اور ہم اس کی تکمیل کر رہے ہیں۔ وہ خلاق مطلق کو مخاطب کرکے انسانی خلاقیوں اور صلاحیتوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم تو گل آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم از زہر نوشینہ سازم

تقدیر، وحدت الوجود اور خودی تینوں مسئلے اور ان کی تشریح بڑا پھیلاؤ چاہتے ہیں، کہ یہاں اس کا موقع نہیں۔ دکھانا صرف یہ مقصود تھا کہ تقدیر اور وحدت الوجود نے عملی طور پر اپنا جو اثر چھوڑا وہ نمود کی بجائے جمود اور سعی و عمل کی بجائے تعطل اور غلط توکل ہے اور اسی کو دور کرکے زندگی میں حرکت پیدا کرنے کے لئے اقبال کے دل و دماغ سے فلسفہ خودی نے جنم لیا۔ خودی کے کچھ مدارج بھی ہیں جن کا آخری درجہ ذات حق سے پیوستگی ہے لیکن یہ وہ مقام نہیں جہاں فنا ہوکر انسان عدم محض ہوجائے بلکہ یہیں آکر اسے بقائے دوام حاصل ہوتی ہے۔ ان مدارج کا ذکر اقبال یوں کرتا ہے:

شاہد اول شعور خویشتن خویش را دیدن بنور خویشتن

شاهد ثانی شعور دیگرے　　خویش را دیدن بنور دیگرے
شاهد ثالث شعور ذات حق　　خویش را دیدن بنور ذات حق

اس سلسلے میں ایک ضروری نقطہ بھی سن لیجئے جس کی طرف غالباً توجہ نہیں دی گئی ہے۔ قوم کا جو عقیدہ و نظریہ ہوتا ہے اسی کے مطابق اس کی زندگی بھی ڈھلتی ہے اور زندگی کے ہر ہر گوشے پر وہ نظریہ اپنا اثر ڈالتا ہے۔ تعلیم، سیاست، تجارت، عبادت، ازدواج، رسم و رواج، طرز بود و ماند، غرض ہر گوشۂ زندگی پر وہ عقیدہ اثر انداز ہوتا ہے۔ وحدت الوجود کے عقیدے نے بھی کچھ ایسے ہی اثرات چھوڑے ہیں۔ متحدہ ہندوستان میں صدیوں ان شیوخ طریقت اور ان غیر مسلموں (بھگتوں اور سادھوؤں) کا اثر و اقتدار رہا ہے جو کسی نہ کسی رنگ میں وحدت الوجود کے قائل رہے ہیں۔ اس عقیدے سے باہمی تعصب تو بہت کم ہو جاتا ہے لیکن وہ عصبیت بھی ختم ہوجاتی ہے جو ایک دین یا ایک قوم کی انفرادی بقا کے لئے لازمی ہے۔ بہر حال اس عقیدے کا اثر یہ پڑا کہ بڑے بڑے مسلمان لیڈر بھی وحدت ادیان کے قائل ہوگئے جس کی واضح شکل برہمو سماج ہے۔ اس کے بعد اس عقیدے نے جب سیاسی رنگ اختیار کیا تو کفر و اسلام کو ملا کر ایک متحدہ قومیت کی بنیاد ڈالی گئی۔ یعنی جب وجود ایک اور دین ایک ہے تو قومیں کیوں دو ہوں؟ متحدہ قومیت کے اس سحر نے بڑے بڑے لوگوں کو متاثر کر لیا اور اس کا پرچار شروع ہوگیا۔ لیکن دوسری طرف اقبال فلسفۂ خودی کو بیدار کرچکے تھے جس نے ایک چھوٹے وجود کو بڑے وجود میں جذب ہوکر ختم ہونے سے بچالیا۔ اسے محمد علی جناح جیسا مرد مومن مل گیا جس نے دو قومی نظریے کا انجکشن لگا کر فلسفۂ خودی کے نیم جان جسد میں جان ڈال دی اور بدلائل یہ واضح کر دیا کہ مسلمانوں کی قوم ایک الگ قوم ہے۔ خودی کا تقاضا اور نتیجہ ہے خود شناسی، خود داری اور خود نگری۔ اسی احساس نے مسلمانوں کو ہندو قوم میں جذب ہوکر ختم ہونے سے بچا لیا مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ تقدیر اور وحدت الوجود کے عقیدے کا سیاسی ایڈیشن متحدہ قومیت کا نظریہ ہے اور فلسفۂ خودی کا سیاسی انعکاس مملکت پاکستان کا علیحدہ وجود ہے۔

محمد جعفر شاہ پھلواروی